Sociology & Cultural Research Review (SCRR)
Available Online: https://scrrjournal.com
Print ISSN: 3007-3103 Online ISSN: 3007-3111
Platform & Workflow by: Open Journal Systems
https://doi.org/10.5281/zenodo.22078862

The Modern Urdu Novel and Narratives of Terrorism: An Analytical Study of Social, Political, and Psychological Tragedies

جدید اردو ناول اور دہشت گردی کے بیانیے: سماجی، سیاسی اور نفسیاتی المیوں کا تجزیاتی مطالعہ

Dr. Zeenat Aman
PhD, Department of Urdu, NUML, Islamabad

Abstract

This article presents the representation of terrorism, extremism, and humanitarian crises within the contemporary Urdu novel. In the post-9/11 era, Urdu novelists have profoundly moved beyond mere reportage to explore the deep psychological and societal scars left by violence. By analyzing key contemporary texts—including Zeef Syed's Gul Meena, Mustansar Hussain Tarar's Qila-e-Jangi, Syed Kashif Raza's Char Darvesh aur Ek Kachwa, and Amjad Javed's Roshan Andhere this study explores how the modern Urdu novel portrays terrorism as a devastating lived experience. Through a literary lens, the research investigates the impact of major national tragedies, such as the Karsaz bombing and the political assassinations at Liaquat Bagh, highlighting the trauma of survivors and the erosion of social structures. The paper concludes that the modern Urdu novel serves as a vital historical and psychological record, effectively capturing the complex "human cost" of extremism while reflecting the resilience of the human spirit in the face of brutality.

Keyword: *Urdu Novel, Terrorism Narratives, Contemporary Fiction, Psychological Trauma, Socio-Political Conflict, Humanitarian Crisis.*

ادب محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے عہد کی سماجی، سیاسی اور فکری تبدیلیوں کا زندہ جاوید عکاس ہوتا ہے۔ اردو ناول، جس کی تاریخ اگرچہ دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں مختصر ہے، ہمیشہ سے اپنے معاشرے کے نبض شناس کے طور پر ابھرا ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں رونما ہونے والے نائن الیون کے عالمی سانحے نے جہاں دنیا کے سیاسی اور معاشی ڈھانچے کو تبدیل کیا، وہاں اردو فکشن کو بھی نئے موضوعات اور ایک گہرے کربناک شعور سے روشناس کرایا۔ زیرِ نظر آرٹیکل میں اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ کس طرح اردو ناول نگاروں نے نائن الیون کے بعد پیدا ہونے والی عالمی افراتفری، دہشت گردی کے عفریت اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے انسانی و تہذیبی تصادم کو اپنے تخلیقی کینوس پر جگہ دی ہے۔ بالخصوص مستنصر حسین تارڑ اور دیگر معاصر ناول نگاروں کے ہاں اس سانحے کے اثرات کس طرح ایک مزاحمتی اور بیانیہ رنگ میں ڈھل کر سامنے آئے ہیں، یہ مطالعہ اسی فکری سفر کی ایک کڑی ہے۔

اردو ناول میں دہشت گردی کے بیانیے اور اس کے سماجی و نفسیاتی اثرات کا تنقیدی جائزہ لینے سے قبل، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ 'دہشت گردی' کے لغوی، اصطلاحی اور فکری حدود و اربعہ کو واضح کر لیا جائے۔ جب تک اس مفہوم کی لسانی اور نظریاتی ساخت کو نہ سمجھا جائے، تب تک اس تناظر میں لکھے گئے ادب اور اس کے تخلیق کردہ المیوں کی گہرائی کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ لفظ "دہشت گردی" عصرِ حاضر کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کے لغوی معنی "خوف و ہراس پھیلانے" کے ہیں اور اس کی جڑیں مختلف زبانوں میں ظلم، سختی اور تباہی سے جڑی ہیں۔ اردو میں یہ لفظ "دہشت" (خوف) اور "گردی" (گردش یا پھیلاؤ) کا مرکب ہے، جبکہ عربی میں اس کے لیے "تصلب" (تشدد اور سختی) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح انگریزی اصطلاح "Terrorism" کی بنیاد لاطینی لفظ "Terrere" اور فرانسیسی "Terrur" پر ہے، جس کا مفہوم معاشرے پر لرزہ طاری کرنا اور وحشت پیدا کرنا ہے۔ تمام زبانوں اور تعریفوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دہشت گردی ظلم و ستم اور فساد کے ذریعے انسانیت کی تباہی کا نام ہے۔ " دہشت گردی" کے مرکب میں لفظ "گردی "بطور لاحقہ ایک خاص معنویت رکھتا ہے۔ جس طرح "گرد" (خاک) ہوا کے ایک معمولی جھونکے سے پوری فضا میں پھیل جاتی ہے، بالکل اسی طرح دہشت گردی کا عمل بھی معاشرے کے امن و سکون کو پل بھر میں تہہ و بالا کر کے خوف و ہراس کو چہار سو پھیلا دیتا ہے۔ اردو میں اس اصطلاح کا

مقبول مفہوم ہی "خوف و ہراس پھیلانا" ہے، جس کے دائرہ کار میں تشدد، دھمکیوں کا استعمال، اور معاشرے میں بے چینی و عدمِ تحفظ کی لہر پیدا کرنا شامل ہے۔ مختصر یہ کہ یہ صرف ایک عمل نہیں بلکہ ایک ایسی وحشت ناک کیفیت کا نام ہے جو گرد کی طرح پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ آکسفورڈ ایڈوانسڈ لرنرز ڈکشنری میں اس کی وضاحت اس طرح ملتی ہے:

"The calculated use of violence or threat of violence to inculcate fear. Terrorism is intended to coerce or intimidate governments or societies in the pursuit of goals that are generally political, religious, or ideological."[۱]

لفظ "Terror" کی اصل قدیم فرانسیسی زبان میں ملتی ہے۔ مشہور لغت "میریم ویبسٹر" کے مطابق، یہ لفظ ایک ایسی شدید خوف کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جو کسی ہولناک واقعے یا خطرے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ یعنی تاریخی اور لسانی اعتبار سے یہ اصطلاح قدیم دور سے ہی "شدید وحشت" کے معنوں میں مستعمل رہی ہے:

"The systematic use of 'Terror' especially as a means of coercion[۲]

مولوی فیروز الدین کے مطابق، اردو میں "دہشت گردی" کی اصطلاح فارسی زبان سے مستعار لی گئی ہے۔ انہوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے اسے لسانی اعتبار سے فارسی پس منظر سے جوڑا ہے، جو اردو میں اسی شدت اور مفہوم کے ساتھ رائج ہوئی: "دہشت گردی فارسی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی ہیں معنی خوف و ہراس پھیلانا۔ [۳]"

نوراللغات کے مطابق، "دہشت گردی" کے متبادل کے طور پر "دہشت انگیزی" کی اصطلاح بھی مستعمل ہے۔ لغت میں اس کا مفہوم "خوفناک قسم کا خوف و ہراس پھیلانا ہے۔"[۴] مختلف لغات کے برعکس دہشت گردی ایک ہمہ گیر اصطلاح ہے جس میں خوف، وحشت، ظلم و جبر، لاقانونیت اور طاقت کا ناجائز استعمال جیسے تمام پہلو شامل ہیں۔ علمی و ادبی سطح پر اس کی جامع تعریف کی سنجیدہ کوشش ۱۹۳۴ء میں کی گئی، جس میں ہارڈمین نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا کہ:

"یہ وہ نظریہ ہے جس کی رو سے کوئی منظم گروہ اپنے مبینہ اہداف کے حصول کے لیے بنیادی طور پر منظم تشدد کا استعمال کرتا ہے۔" [۵]

ماہرین کے مطابق دہشت گردی کا بنیادی مقصد سیاسی مفادات کا حصول ہے، جس کے لیے شعوری طور پر تشدد اور تباہی کا راستہ چنا جاتا ہے۔ اس عمل میں امن کی جگہ بربریت کو فوقیت دی جاتی ہے تاکہ تخریبی کارروائیوں کے ذریعے ملک میں انتشار اور بدامنی پھیلائی جا سکے۔ وسیع تناظر میں، جب غیر ملکی قوتیں یا خود ریاست اپنے مخصوص مقاصد کے لیے طاقت کا بے جا استعمال کر کے خوف کی فضا پیدا کرتی ہیں، تو اسے "ریاستی دہشت گردی" کہا جاتا ہے۔ اسی حوالے سے "انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا" میں دہشت گردی کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"Terrorism-the Systematic use of terror or unpredictable violence against government public or individuals to attain a political objective Terrorism has been used by political organizations with both rights and objectives by nationalistic and echoic groups by revolutionaries and by the armies and secret police of governments themselves".[۶]

دہشت گردی دراصل اپنے سیاسی، نظریاتی یا گروہی مقاصد منوانے کے لیے حکومت اور عوام کے خلاف منظم تشدد اور خوف و ہراس پھیلانے کا نام ہے۔ اس میں انتہاپسند تنظیمیں، نسلی و لسانی گروہ اور بعض اوقات ریاست کے اپنے ادارے (فوج یا پولیس) بھی ملوث ہو سکتے ہیں۔ اس کا اصل ہدف بے گناہ لوگوں کو نشانہ بنا کر معاشرے میں عدم تحفظ اور وحشت پیدا کرنا ہے، تاکہ دباؤ کے ذریعے ناجائز اہداف حاصل کیے جا سکیں۔ دہشت گردی کا بنیادی مقصد خوف و دہشت کا ماحول پیدا کرنا ہے، جس کے لیے قتل و غارت، بم دھماکوں، اغوا اور املاک کو آگ لگانے جیسے سنگین جرائم کا سہارا لیا جاتا ہے۔ دہشت گردوں کے عزائم عام مجرموں سے مختلف ہوتے ہیں؛ وہ شعوری طور پر عوامی مقامات، عمارتوں اور عبادت گاہوں کو نشانہ بناتے ہیں تاکہ بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان کے ذریعے اپنے مذموم مقاصد حاصل کر سکیں۔ اسی تناظر میں ڈاکٹر طاہر القادری کے مطابق:

"بے گناہ انسانوں کا قتل دہشت گردی ہے۔ اسی طرح انسانی املاک کو تباہ کرنا، انسان خواہ وہ مسلمان

ہو یا غیر مسلم کسی بھی مذہب کے لوگ ہوں جو پُرامن ہوں، جنگ میں آپ کے خلاف شریک نہ ہوں، ان کا تعلق خواہ کسی بھی ملک کے ساتھ ہو اور ملک بے شک آپ کے ساتھ حالت جنگ میں کیوں نہ ہو مگر وہ عوام جو جنگ میں ملوث نہیں ہیں۔ ان کو قتل کرنا، بوڑھوں، بچوں اور بیماروں کو مارنا، عبادت گاہوں، ہسپتالوں اور دیگر جگہوں پر بم دھماکے کرنا عام زندگی میں خلل ڈالنا، دوسروں کی جان و مال اور عزت کے لیے انہیں ہراساں کرنا، نظام زندگی کو درہم برہم کرنا، دنگا فساد، گھیراؤ کی دھمکی دینا اور دھمکیوں کے ساتھ ہڑتالیں کروانا، سیکیورٹی کو خطرے میں ڈال دینا، دوسرے کے مذہب پر حملہ کرنا، ان کی آزادی پر حملہ خواہ وہ کسی بھی نام پر ہو یہ دہشت گردی ہے اور جو ان کا ارتکاب کرے وہ دہشت گرد ہے۔" [۷]

مفکرین کی تعریفات کا نچوڑ یہ ہے کہ دہشت گردی سیاسی، مذہبی یا نظریاتی مقاصد کے لیے تشدد اور خوف کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کا نام ہے، تاکہ مخالفین پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ اہم بات یہ ہے کہ اسلام سمیت کوئی بھی مذہب بے گناہ انسانوں یا عبادت گاہوں کو نشانہ بنانے کی اجازت نہیں دیتا اور انسانی خون بہانے والا ہر صورت مجرم ہے۔ مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ دہشت گردی کا بنیادی مقصد محض تشدد اور تباہی کے ذریعے ذاتی یا سیاسی مفادات کا حصول ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی کا ناسور بڑی حد تک بیرونی قوتوں کی مفاد پرستی کا نتیجہ ہے۔

سیموئیل پی ہنٹنگٹن اپنی کتاب "تہذیبوں کا تصادم" میں دہشت گردی کی بنیادی وجہ نظریاتی یا معاشی تفریق کے بجائے ثقافتی و تہذیبی اختلاف کو قرار دیتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اب عالمی سیاست مذہب، نسل اور رسم و رواج کے گرد گھوم رہی ہے، جہاں مختلف تہذیبیں اپنی برتری کے لیے ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ ہنٹنگٹن کے مطابق مسلم آبادی میں اضافہ، ایشیا کا معاشی ابھار، چین کی بڑھتی ہوئی طاقت اور انسانی حقوق و جمہوریت جیسے معاملات نے اس تہذیبی جھگڑے کو مزید ہوا دی ہے۔ جب مختلف تہذیبیں اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے ایک دوسرے کے سامنے آتی ہیں، تو یہی کشمکش دہشت گردی کے جنم لینے کا بڑا سبب بنتی ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

"ابھرتی ہوئی عالمی (گلوبل) سیاست میں بڑی تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں سرد جنگ کی دو سپر پاوروں کو دوسرے ملکوں کے لیے کشش اور گریز کے اہم قطبین کے طور پر جگہ لے رہی ہیں۔ یہ تبدیلیاں مغربی، آرتھوڈوکس اور چینی تہذیبوں کے حوالے سے زیادہ واضح طور پر نمایاں ہیں۔ ان تہذیبی بلاکوں میں شامل ریاستیں اپنے شناخت کے درجے اور اس بلاک سے ارتباط کو ظاہر کرتے ہوئے اکثر مرکزی ریاست یا ریاستوں کے گرد ہم مرکز دائروں میں تقسیم ہونے کی طرف مائل ہوتی ہیں۔"[۸]

اکیسویں صدی میں جہاں انسان نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں بے پناہ ترقی کی ہے، وہیں اسے دہشت گردی جیسے عالمگیر عفریت کا بھی سامنا ہے۔ یہ مسئلہ اب کسی ایک خطے یا قوم تک محدود نہیں رہا بلکہ پوری انسانیت کے لیے ایک سنگین چیلنج بن چکا ہے۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جدید ترین ایجادات کے باوجود انسان ہی انسان کا دشمن بن گیا ہے؛ عبادت گاہیں، سرکاری عمارتیں اور تعلیمی ادارے تک ان خونریز حملوں سے محفوظ نہیں۔ دہشت گردی کی اس لہر نے پاکستان سمیت پوری دنیا کے امن و سکون کو درہم برہم کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں عدم تحفظ اور خوف کی ایسی فضا پیدا ہو چکی ہے کہ زندگی کی بقا ایک خواب معلوم ہوتی ہے۔ بدامنی اور انتشار نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اب دنیا کا ہر طبقہ اس مشترکہ مسئلے کے پائیدار حل کے لیے تدبیریں کرنے پر مجبور ہے۔

کسی بھی خطے میں خوف و ہراس اور افراتفری پھیلانے کا عمل دہشت گردی کے زمرے میں آتا ہے۔ انسانی تاریخ میں قتل و غارت کا آغاز حضرت آدمؑ کے بیٹوں، ہابیل اور قابیل کے قصے سے ہوا، جہاں ذاتی مقصد کے لیے زمین پر پہلا خون بہایا گیا۔ آج صورتحال یہ ہے کہ دنیا کا کوئی کونہ اس شکنجے سے محفوظ نہیں اور معاشرہ ایک ایسے جنگل کی تصویر بن چکا ہے جہاں رحم و ہمدردی سے عاری "انسانی درندوں" کا راج ہے، جو بغیر کسی واضح مقصد کے انسانی جانوں سے کھیل رہے ہیں۔ اگرچہ دہشت گردی کی تاریخ بہت قدیم ہے، لیکن اس پر باقاعدہ تحقیق گزشتہ تین دہائیوں کی پیداوار ہے اور ابھی تک اس کی کوئی متفقہ عالمی تعریف وضع نہیں ہو سکی۔ ماہرین کے مطابق اس کے پھیلاؤ میں

معاشی یا معاشرتی اسباب سے زیادہ دیگر عوامل کار فرماہیں۔ زمانہ قدیم میں یہودیوں کا گروہ 'سکرئی (Sicarii) 'اس کی ایک نمایاں مثال ہے، جو مذہبی ایام میں عبادت گاہوں پر حملے کر کے لوگوں میں خوف پیدا کرتا تھا۔ اس حوالے سے انعام الرحمن سحری لکھتے ہیں:

> "دہشت گردی کی تعریف اس لیے مشکل ہے کہ دہشت گردی کو مختلف موقعوں پر مختلف معانی دیے جاسکتے ہیں۔ مختلف ماہرین عمرانیات کے نزدیک دہشت گردی کی تعریف میں الگ الگ عناصر پائے جاتے ہیں۔ البتہ تاریخ دانوں نے دہشت گردی کے ضمن میں ملک ملک کی تاریخ صدیوں اور لمحوں کے حوالے سے پڑھی ہے۔ انہوں نے لیڈران کی زندگیوں کو بھی کھنگالا ہے اور حکومت کی تبدیلیوں کو بھی قریب سے دیکھا ہے۔ پس انہوں نے معاشرتی اور معاشی حالات کی روشنی میں دہشت گردی کے صحیح مفہوم کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تعریف کے مراحل طے کرتے ہوئے بعض ماہرین عمرانیات دہشت گردی کو اس لیے بھی کوئی جامع روپ نہیں دیتے کہ کئی حکومتیں اپنے مذموم سیاسی مقاصد اور سیاسی انتقام کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اس راستے سے ہوتے ہوئے وہ اپنے اپنے ملک میں موجود چھوٹی سیاسی جماعتوں کو ختم کر دینا پسند کرتی ہیں۔" (۹)

دہشت گردی کسی بھی ریاست کی سلامتی کے لیے سب سے سنگین خطرہ ہے، اور پاکستان طویل عرصے سے اس چیلنج کا سامنا کر رہا ہے۔ انسانی زندگی فطری طور پر انمول ہے اور انسان آخری سانس تک جینے کی تمنا رکھتا ہے، لیکن دہشت گردی کا سب سے خوفناک پہلو یہ ہے کہ ایک جیتے جاگتے انسان کو اس حد تک مجبور یا مائل کر دیا جاتا ہے کہ وہ خودکش جیکٹ پہن کر اپنی اور دوسروں کی زندگیوں کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ آج دنیا کے ترقی یافتہ ممالک بھی اس پوشیدہ خطرے سے سہمے ہوئے ہیں کیونکہ یہ حملے کسی بھی وقت اور کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ اصل غور طلب بات یہ ہے کہ کوئی بھی انسان پیدائشی دہشت گرد نہیں ہوتا، بلکہ وہ مخصوص حالات، ماحول اور منفی محرکات کی پیداوار ہوتا ہے۔

دہشت گردی میں ملوث گروہ یا عالمی طاقتیں اپنے مخصوص مفادات کے لیے مذہب، اخلاقیات اور انسانیت کی تذلیل کرتے ہیں۔ کوئی بھی نارمل انسان محض چند روپوں یا نظریاتی جنون کی خاطر معصوموں کا خون نہیں بہا سکتا؛ ایسا فعل صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو یا تو ذہنی مریض ہو یا جس کی برین واشنگ کی گئی ہو۔ پاکستان کے تناظر میں معاشی ناہمواری دہشت گردی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ جب معاشرے پر قابض مخصوص اشرافیہ تمام وسائل سمیٹ لیتی ہے اور غریب کے لیے دو وقت کی روٹی کا حصول بھی ناممکن بنا دیتی ہے، تو یہی معاشی محرومی انتہا پسندی اور بغاوت کو جنم دیتی ہے۔ غربت کی چکی میں پسا ہوا شخص جب معاشرے میں اپنی عزت اور مستقبل سے مایوس ہو جاتا ہے، تو وہ پیسوں یا کسی مخصوص نظریے کے بدلے اپنی اور دوسروں کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

دہشت گردی ایک ایسا عالمی عفریت بن چکا ہے جس سے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر، تمام ممالک یکساں متاثر ہو رہے ہیں۔ اس مسئلے کا کوئی ایک سادہ حل نہیں، بلکہ اسے جڑ سے اکھاڑنے کے لیے کثیر الجہتی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ جہاں عسکری قوتیں طاقت کے ذریعے اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کر رہی ہیں، وہیں ادیبوں اور دانشوروں پر بھی لازم ہے کہ وہ فکری سطح پر اس کے خلاف آواز بلند کریں۔ تلخ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، لیکن اس کا سب سے زیادہ جانی، مالی اور فکری نقصان مسلمانوں اور خاص طور پر پاکستان کو اٹھانا پڑا ہے۔ دوسروں کی جنگوں میں شامل ہونے اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر پاکستان کو مہاجرین کی آبادکاری، معاشی عدم توازن، افراطِ زر اور سماجی جرائم جیسے سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم، سب سے اہم پہلو انسانیت کا قتل ہے۔ دہشت گرد جب بھی کہیں حملہ کرتے ہیں، تو رنگ و نسل اور مذہب سے بالاتر ہو کر انسانیت تڑپ اٹھتی ہے۔ کسی بھی ایک بے گناہ کی جان کا ضیاع درحقیقت پورے ملک اور انسانیت کا نقصان ہے، جس کا درد ہر محبِ وطن محسوس کرتا ہے۔

عہدِ حاضر میں اردو ادب فکری اور فنی دونوں سطحوں پر بڑی تیزی سے ارتقائی مراحل طے کر رہا ہے۔ موجودہ دور چونکہ آزمائش اور عالمی تبدیلیوں کا دور ہے، اس لیے اردو ادب کی بقا اور عالمی شناخت کے لیے ایسے معیاری ادب کی تخلیق ضروری ہے جو نئے رجحانات کا ہم پلہ ہو۔ کوئی بھی تخلیق کار اپنے معاشرے سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا، بلکہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات کو ہی الفاظ کا روپ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہمارے ماحول میں بم دھماکے، خون خرابہ اور وحشت بڑھی، تو اردو ناول، افسانے، نظم اور غزل میں ان تلخ حقائق کی تصویر کشی نمایاں ہونے لگی۔ اردو کے ادیبوں اور شعراء نے عالمی سطح پر دہشت گردی کے مرتب ہونے والے گہرے اثرات کو اپنی تحریروں کا موضوع بنا کر نہ صرف انسانی المیوں کو محفوظ کیا ہے بلکہ جدید ادب کو ایک نئی سمت بھی عطا کی ہے۔

تخلیق کا عمل ایک انتہائی حساس اور طویل سفر ہے جو انسانی احساس سے شروع ہو کر الفاظ کے قالب میں ڈھلتا ہے۔ جس طرح ۹/۱۱ کے واقعے نے عالمی منظر نامے کو بدلا، اسی طرح اس کے اثرات اردو ادب پر بھی بہت گہرے ثابت ہوئے اور اس موضوع پر بے شمار افسانے، ناول اور ڈرامے تخلیق کیے گئے۔ چونکہ پاکستان براہِ راست دہشت گردی کی لہر سے متاثر ہوا، اس لیے یہاں کے ادیبوں اور شعراء نے اس کرب کو اپنی تحریروں کا خاص موضوع بنایا۔ ان کی تخلیقات میں جبر و استحصال، فرقہ وارانہ فسادات اور دہشت گردی سے جڑے مختلف سماجی جرائم کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اسی تناظر میں ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> "یہاں اس بات پر بحث کرنا مقصود نہیں کہ رویہ کس حد تک جائز اور یک طرفہ ہے۔ یہاں صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جب بھی ملکی سیاست یا معاشرتی زندگی کے افق پر کوئی قابل ذکر واقعہ رونما ہوا اردو ادیبوں نے اپنی تخلیق کا موضوع ضرور بنایا ہے۔"(۱۰)

نائن الیون کے بعد پاکستانی اردو اصناف میں نئے فکری موضوعات کا اضافہ ہوا جو براہِ راست سماجی حقائق سے جڑے ہوئے ہیں۔ عالمی طاقتوں نے اپنے مفادات کی خاطر چھوٹے ممالک کی معیشت، ثقافت اور مذہبی روایات کو نقصان پہنچایا، جبکہ اقوامِ متحدہ نے ان مظالم کو روکنے کے بجائے بڑی قوتوں کا ساتھ دیا۔ اس عمل میں عراق، افغانستان اور پھر پاکستان کو شدید نشانہ بنایا گیا۔ اس واقعے کے بعد میڈیا کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف منفی پروپیگنڈا کیا گیا اور انہیں دہشت گردی سے منسوب کر دیا گیا۔ ان حالات نے نہ صرف ہماری سیاست اور اقتصادیات کو بدلا، بلکہ ہماری تہذیبی اقدار اور شعری اصناف خصوصاً غزل پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے، جن میں اس دور کے دکھ اور محرومیاں نمایاں ہیں۔ اردو ناول کی تاریخ اگرچہ ڈیڑھ سو سال پر محیط ہے، لیکن معیاری تخلیقی ناولوں کی تعداد اب بھی محدود ہے۔ نائن الیون اکیسویں صدی کا وہ عظیم سانحہ ہے جس نے دنیا کے معاشی اور سماجی حالات بدل دیے، اور چونکہ ادب اپنے عہد کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس لیے اردو ناول نگاروں نے بھی اس موضوع کو اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔ کسی بھی بڑے واقعے کو ادب کا حصہ بننے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے تاکہ اس کے اثرات واضح ہو سکیں۔ نائن الیون اور دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے اہم ناولوں میں مشرف علی ذوقی کا "پوکے مان کی دنیا "۲۰۰۲ء اور بانو قدسیہ کا "حاصل گھاٹ "۲۰۰۳ء قابلِ ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں مستنصر حسین تارڑ کے ناول "قلعہ جنگی "اور "خس و خاشاک زمانے "غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ "قلعہ جنگی" میں تہہ خانے میں قید مختلف ممالک کے زخمی جنگجوؤں کے ذریعے تہذیبوں کے تصادم اور عالمی افراتفری کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے، جہاں مصنف نے عالمی طاقتوں کے کردار اور دہشت گردی کی لپیٹ میں آتی دنیا کے کرب کو موضوع بنایا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ناول "قلعہ جنگی" ۲۰۰۴ء نائن الیون کے اثرات پر لکھی گئی ایک اہم ترین دستاویز ہے۔ یہ کہانی قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں قید مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے سات طالبان جنگجوؤں کی آپ بیتیوں پر مبنی ہے۔ ناول کا ایک منفرد پہلو جنگ کے ہولناک اثرات کو ایک زخمی گھوڑے کی آنکھ سے دکھانا ہے۔ تارڑ نے بڑی مہارت سے یہ حقیقت عیاں کی ہے کہ کس طرح عالمی طاقتوں نے اپنے مفادات کی خاطر ان لوگوں کو استعمال کر کے بے یار و مددگار چھوڑ دیا، اور کس طرح نائن الیون کے بعد طالبان اور القاعدہ کے خلاف انتقامی کارروائیوں نے پورے خطے کو تباہی سے دوچار کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فوزیہ چوہدری کی رائے اہم ہے:

> "جب افغانستان پر روس نے حملہ کیا تو ہزاروں عرب ادھر آنکلے اور القاعدہ سے متاثر ہوئے۔۔۔ امریکہ اور یورپ کی آنکھوں کے تارے جن کی جھولیاں ڈالروں اور ہتھیاروں سے بھر دی جاتی تھیں۔ یہ وہی مجاہدین اور ہیرو تھے جو ۹/۱۱ کے بعد دہشت گرد بن گئے۔ پہلے یہ جہاد تھا کہ روس مدمقابل تھا اور اب یہ دہشت گردی ہے کہ وہ اپنا دفاع کر رہے تھے۔"(۱۱)

ناول "قلعہ جنگی "میں امریکہ افغانستان جنگ کے پس منظر میں جنگی قیدیوں کے شدید مزاحمتی رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ قیدی اپنی بقا کے لیے کس طرح فرار کی کوشش کرتے ہوئے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ تاہم، اس مزاحمت کے جواب میں امریکی طیاروں کی وحشیانہ بمباری تمام قیدیوں کی دردناک اور المناک موت پر منتج ہوتی ہے۔ ناول نگار نے ان طالبان کی بے بسی کی مؤثر تصویر کشی کی ہے جنہیں بڑی طاقتوں نے سیاسی مقاصد کے لیے آلہ کار بنایا اور حالات بدلتے ہی بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ نائن الیون کے بعد بدلتی صورتحال نے پوری ملتِ اسلامیہ کو لپیٹ میں لے لیا، اور نظریاتی جنگ کا حصہ بننے والوں کے لیے دنیا بھر میں زمین تنگ کر دی گئی، یہاں تک کہ موت ہی ان کا مقدر ٹھہری۔ مستنصر حسین تارڑ نے پاک افغان خطے پر جنگ کے اثرات اور ایک بڑے عالمی تضاد کو واضح کیا ہے؛ جن مجاہدین کو روس کے خلاف جنگ میں امریکہ نے خود تربیت دے کر "ہیرو" بنایا، نائن الیون کے بعد وہی اچانک "دہشت گرد" قرار پائے۔ قلعہ جنگی کے قیدیوں کی کہانی اسی عالمی سیاست کے ہاتھوں

استعمال ہونے کا نوحہ ہے۔ شدید بھوک پیاس اور موت کے سائے میں بھی ان قیدیوں کا مطمئن نظر آنا اس عالمی سازش کے خلاف ایک خاموش احتجاج ہے، جس نے انہیں جہاد کے نام پر استعمال کیا اور مطلب نکلنے پر پھینک دیا۔ مصنف کے مطابق انہیں اعلیٰ مقاصد کا جھانسہ دیا گیا اور بعد میں نائن الیون کا سارا ملبہ ان پر ڈال کر افغانستان کو تہس نہس کر دیا گیا۔ مزار شریف پر حملے کے بعد کے ہولناک منظر کی عکاسی تارڑ صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"مزار شریف میں ہتھیار ڈالنے کے بعد وہ انہیں ہانکتے ہوئے قلعہ جنگی میں لے جاتے تھے اور پھر ان کی مشکیں کسی جانے لگیں، پشت پیچھے ہاتھ باندھے جانے لگے تو نروس ہو گئے۔ وہاں دو غیر ملکی ٹیمیں بھی موجود تھیں۔ جن کے کیمرے ان پر تھے۔ وہ ہراساں ہو گئے کہ ان کو اجتماعی طور پر قتل کیا جانے لگا ہے کہ روایت یہی تھی اور جن کے ہاتھ ابھی بندھے ہوئے نہیں تھے انہوں نے بغاوت کر دی۔ شمالیوں کو اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو ان کو فتنہ پروری سے روکنے کے لیے باندھ رہے تھے۔ ان کے قتل کا فیصلہ ابھی نہیں تھا ہوا۔ لیکن وہ حواس کھو بیٹھے اور جن کی تلاشی مکمل نہیں ہوئی تھی وہ اپنے ہتھیار نکال کر فائر کرنے لگے۔ دو ستم کا پولیس چیف ان کا نشانہ بن گیا۔" (۱۲)

مستنصر حسین تارڑ کا ناول "خس و خاشاک زمانے" ۲۰۱۰ء دہشت گردی کے پس منظر میں تہذیبوں کے تصادم اور عالمی سطح پر پھیلی افراتفری کا گہرا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ ناول کے مطابق موجودہ دور کے پر آشوب حالات میں عالمی طاقتوں کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا ہے، جنہوں نے عام انسان کو خوف اور غیر یقینی صورتحال کا شکار کر دیا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فوزیہ چوہدری اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں کہ اردو ناول میں دہشت گردی جیسے حساس اور عصری موضوعات کا شامل ہونا ایک مثبت قدم ہے، کیونکہ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے ادب اپنے عہد کی تلخ حقیقتوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے:

"دوسری اصناف ادب کے برعکس اردو ناول کے حوالے سے یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ دہشت گردی اور دہشت گرد عناصر کو مکمل طور پر ایک ناول کا حصہ بننے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں کوئی بڑا واقعہ رونما ہو تو عصری ادب میں اس کا اثر ظاہر نہ ہو۔ دہشت گردی اور ۱۱/۹ کا واقعہ جس نے دنیا کے سیاسی، سماجی، اخلاقی اور معاشی حالات کا رخ بدل کر رکھ دیا ہو، کس طرح ممکن تھا کہ عصری ادب اس کا عکاس نہ ہوتا۔" (۱۳)

اردو ناول نگاروں نے نائن الیون کے بعد بدلتے ہوئے عالمی اور مقامی حالات کو نہایت مؤثر طریقے سے قلمبند کیا ہے۔ محمد الیاس نے "برف" میں مذہبی انتہا پسندی، جبکہ یونس جاوید نے "ستونت سنگھ کا کالا دن" میں پاکستان کی غیر یقینی سیاسی صورتحال کو موضوع بنایا ہے۔ ایم اختر کا ناول "ایٹمی طاقت" اسامہ بن لادن اور ایبٹ آباد آپریشن کے گرد گھومتا ہے۔ تارکین وطن کے کرب کو محسنہ جیلانی نے اپنے ناولٹ "میں دہشت گرد ہوں" میں پیش کیا ہے، جہاں ایک پاکستانی کردار کو محض شناخت کی بنیاد پر "دہشت گرد" کہہ کر ذہنی مریض بنا دیا جاتا ہے۔ مرزا اطہر بیگ نے اپنے سائنس فکشن ناول "صفر سے ایک تک" میں بھی اس سانحے کے بعد کے سماجی اثرات کو دکھایا ہے۔ اسی طرح آزاد مہدی کا مختصر ناول "اس مسافر خانے میں" بھی موضوعاتی طور پر دہشت گردی کے اثرات کو ہی بیان کرتا ہے، جس میں مصنف خود ایک کردار کے طور پر اپنے دوستوں کو آپ بیتی سناتا ہے:

"میں نے حیران ہو کر کہا اور اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا: پتہ نہیں مذہب میں تشدد کا جواز کیسے تلاش کیا گیا۔۔۔؟ لیکن میں تجھے بتاتا ہوں خدا پرستوں کا رویہ۔ انہوں نے یہاں تک ایک دفعہ خدا کی حمایت کر دی کہ مزار شریف میں لاش پر کوڑے مکمل ہوئے تب مردے کو قبر میں اتارنے کی اجازت ہوئی اور یہ مرنے والے کی خواہش تھی کہ مجھے مزار شریف میں دفن کیا جائے یہ شہر مرنے والے کو پسند تھا۔ اس کا تقدس اس کے دل میں بہت تھا مگر بیچارے کو یہ خواہش بہت مہنگی پڑی اور مرنے کے بعد بھی پٹتا رہا۔ بھلا ہو امریکیوں کا کہ وہ ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک بار پھر حجاموں کو استرے قینچی کی اجازت دے دی۔" (۱۴)

یہ ایک حقیقت ہے کہ دہشت گردی نے پاکستانی معاشرے کو جانی اور مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اور سماجی طور پر بھی شدید متاثر کیا ہے۔ آج دنیا اگرچہ ٹیکنالوجی اور مواصلات کے میدان میں بے پناہ ترقی کر کے "گلوبل ویلج" بن چکی ہے، لیکن دہشت گردی کا سنگین مسئلہ اب بھی عالمی امن کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے۔ بدقسمتی سے بین الاقوامی برادری اس عفریت پر قابو پانے میں تاحال ناکام نظر آتی ہے، جہاں عالمی سیاست میں اب بھی "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا قانون غالب ہے اور طاقتور ممالک کمزور اقوام پر اپنا تسلط برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ نائن الیون کے بعد دہشت گردی ایک عالمی مسئلہ بن چکی ہے جس نے دنیا بھر کے امن کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اگرچہ یہ ایک قدیم مظہر ہے، لیکن آج تک اس کی کوئی متفقہ تعریف سامنے نہیں آ سکی، اور عالمی برادری اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے مسلسل کوششیں کر رہی ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار اپنے عہد اور معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ وہ اپنی سوچ، کہانی کے کردار اور پلاٹ اپنے گردوپیش سے ہی اخذ کرتا ہے۔ اگر معاشرے میں خوف، دہشت، بم دھماکے اور انسانی لہو کی ارزانی ہو گی، تو فطری طور پر ادیب کی نظم، افسانے اور ناول میں بھی وہی کرب اور وحشت منعکس ہو گی۔

دہشت گردی کے جس کربناک تجربے سے ہم گزر رہے ہیں، اسے مکمل طور پر تخلیقی شعور کا حصہ بننے میں شاید ابھی طویل عرصہ درکار ہو۔ اردو ناول کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ صنف دیگر اصناف (جیسے غزل یا افسانہ) کے مقابلے میں شروع ہی سے کم مائیگی کا شکار رہی ہے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ اردو ناول جنگِ آزادی، تحریکِ پاکستان اور ہجرت جیسے بڑے موضوعات کا حق بھی پوری طرح ادا نہ کر سکا اور لاتعداد کہانیاں کاغذ پر اترنے سے پہلے ہی ذہنوں میں دفن ہو گئیں۔ اردو میں خالص ادبی اور فکری ناولوں کی تعداد پہلے ہی کم ہے، کیونکہ اس صنف کا ایک بڑا حصہ ڈائجسٹوں کی سطحی کہانیوں تک محدود رہا۔ یہی وجہ ہے کہ دہشت گردی جیسے اہم اور عالمی موضوع پر بھی بہت کم ناول تخلیق کیے گئے ہیں۔ تاہم، اس کمی کے باوجود چند ایسے ناول نگاروں نے قلم اٹھایا جنہوں نے اس تلخ حقیقت کو اپنا موضوع بنایا؛ ذیل میں انہی تخلیقات کا مختصر جائزہ پیشِ نظر ہے۔

زیف سید کا ناول "گل مینہ" ایک ایسے لرزہ خیز اور پر تشدد ماحول کی عکاسی کرتا ہے جو دہشت گردی اور انتہا پسندی سے متاثرہ علاقوں کا خاصہ ہے۔ کہانی کے واقعات اس جبر کو بے نقاب کرتے ہیں جہاں ریاست کی گرفت کمزور پڑ جاتی ہے اور غیر ریاستی عناصر اپنی من مانی عدالتیں قائم کر لیتے ہیں۔ 'طالبان' اور 'ملا صاحب' جیسے کرداروں کے ذریعے مصنف نے دکھایا ہے کہ کس طرح ایک مسلح گروہ طاقت کے بل بوتے پر فیصلے کرتا ہے۔ ناول کا ایک اہم منظر موسیٰ خان کی گرفتاری اور اسے ذلیل و رسوا کر کے لانے کا ہے، جو دہشت گرد گروہوں کے اس مخصوص طریقے کو ظاہر کرتا ہے جس کا مقصد عوام میں خوف و ہراس پیدا کرنا اور قیدی کی ہمت توڑنا ہے۔ اس بیانیے میں انتقام کو انصاف کا رنگ دیا گیا ہے؛ مخالف کو 'غدار' قرار دے کر اس کا قتل جائز سمجھا جاتا ہے اور 'ملا صاحب' کا کردار خود ہی مدعی، گواہ اور منصف بن کر سامنے آتا ہے۔ بارودی سرنگوں کا تذکرہ اس دیرپا دہشت گردی کی علامت ہے جو جنگ ختم ہونے کے بعد بھی معصوم جانوں کے لیے خطرہ بنی رہتی ہے۔ اس کہانی کا سب سے لرزہ خیز پہلو انسانی زندگی کی توہین ہے، جہاں موت کو بھی ایک وحشیانہ تماشہ بنا دیا جاتا ہے۔ موسیٰ خان کو جان بچانے کے لیے بھاگنے کا 'موقع' دینا دراصل اسے رعایت دینا نہیں بلکہ اس کے قتل کو ایک اذیت ناک کھیل میں بدلنا ہے۔ پائندہ خان کو ایک بھاگتے ہوئے انسان پر نشانہ بازی کا حکم دینا اس مسخ شدہ انسانی نفسیات کی عکاسی کرتا ہے جہاں دہشت گردی کے زیرِ اثر کسی کی جان لینا محض تفریح یا فن کا مظاہرہ بن جاتا ہے۔ یہ پورا منظر نامہ اس ہولناک حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ انتہا پسندی کے غلبے میں انسانی ہمدردی اور مکالمہ ختم ہو جاتا ہے اور صرف طاقت و تشدد ہی حتمی فیصلہ بن جاتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ یہ متن جنگ اور دہشت گردی کے دور میں انسانی حقوق کی بدترین پامالی کی ایک دردناک دستاویز ہے:

> "پائندہ خان گھٹنے پر رائفل ٹکائے، اپنی لنگڑی ٹانگ ایک عجیب زاویے پر موڑے، شست میں سے دیکھتے ہوئے نال بھاگتے ہوئے موسیٰ خان کے ساتھ ساتھ گھما رہا تھا۔ لیکن شاید اسے اپنے ہنر کی نمائش کا موقع نہیں ملے گا۔ موسیٰ چٹان کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کی رفتار تھوڑی سست پڑ گئی تھی لیکن اتنی نہیں کہ وہ چٹان تک نہ پہنچ سکے۔ ابھی زرجانان یہی سوچ رہا تھا کہ جہاں موسیٰ خان بھاگا جا رہا تھا وہاں مٹی کا ایک بادل زمین میں سے تیزی سے نکل کر بیس پچیس فٹ تک ہوا میں بلند ہوا اور پھر بکھر گیا۔ دھماکے کی گھٹی ہوئی آواز ایک لمحے کے بعد آئی۔ زرجانان نے موسیٰ خان کی پگڑی ہوا میں دور تک فٹ بال کی طرح اچھلتے دیکھی۔ دھول آہستہ آہستہ نیچے بیٹھنے لگی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ دشت میں سورج کی زرد آلود آخری کرنیں رخصت ہونے لگیں۔"(۱۵)

دہشت گردی اور انتہا پسندی کا یہ وحشیانہ روپ صرف کسی ایک خطے یا تحریک تک محدود نہیں رہتا، بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں اس کی ہولناکی معصوم انسانوں کو اسی طرح نگلتی رہی ہے۔ پاک افغان سرحد پر جاری اس بربریت کی طرح، برصغیر کی دیگر تحریکوں نے بھی انسانیت کو گہرے زخم دیے۔ چنانچہ، امجد جاوید کے ناول "روشن

اندھیرے "میں کنول جیت کا کردار انتہاپسندی کے ہاتھوں برباد ہونے والی زندگیوں کی ایک دردناک عکاسی کرتا ہے۔ اس کی پرسکون زندگی اس وقت تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی جب اس کا بھائی 'خالصتان تحریک' میں شامل ہوا۔ اس نظریاتی تصادم کی سزا پورے خاندان کو بھگتنی پڑی اور ایک دن کالج سے واپسی پر کنول جیت کو اپنے والدین اور بہن بھائیوں کی خون آلود لاشیں ملیں، جسے بظاہر ڈکیتی کا رنگ دیا گیا تھا۔ اس ہولناک صدمے نے معصوم کنول جیت کو انتقام کی آگ میں جھونک دیا، جہاں دہلی جیسے اجنبی شہر میں خالصتان تحریک کے کارندوں نے اس کا سہارا بن کر اسے اپنے سیاسی اور مسلح مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ کہانی کے ہیرو 'شجاع' کے سامنے جب وہ اپنے ماضی کے یہ بھیانک پتے کھولتی ہے تو دہشت گردی کا مکروہ چہرہ پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔ کنول جیت کی یہ داستان ثابت کرتی ہے کہ حقوق کے نام پر اٹھنے والی تحریکیں جب تشدد کا راستہ اختیار کرتی ہیں، تو ان کا سب سے زیادہ خمیازہ ان بے گناہ خاندانوں کو بھگتنا پڑتا ہے جن کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انتہاپسندی کا حاصل صرف اجڑے ہوئے گھر، بکھرے خواب اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دہشت گردی اور انتہاپسندی ہنستے بستے خاندانوں کو برباد کر دیتی ہیں، اور کنول جیت اسی ظلم کا شکار ہوئی۔ جب کوئی تحریک تشدد کا راستہ اپناتی ہے، تو وہ سب سے پہلے اپنے ہی اپنوں کی موت کا سبب بنتی ہے، جیسے کنول جیت کے بھائی کی وابستگی اس کے پورے خاندان کے قتل کی وجہ بنی۔ اس ہولناک صدمے نے اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑکائی، جس کا فائدہ اٹھا کر دہشت گرد نیٹ ورکس نے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ یہ گروہ بین الاقوامی سازشوں اور بیرونی پناہ گاہوں کے سہارے، مذہب اور جذبات کی آڑ میں انسانیت دشمن کھیل کھیلتے ہیں۔ اس نیٹ ورک کا ایک اور بھیانک رخ "حیاتیاتی تخریب کاری" ہے، جہاں جعلی اور نشہ آور ادویات کو ہتھیار بنا کر انسانی زندگیوں سے کھیلا جاتا ہے تاکہ معاشرے کو کھوکھلا اور ریاستی ڈھانچے کو کمزور کیا جا سکے۔ ان کا اصل مقصد صرف پیسہ کمانا نہیں بلکہ خوف و ہراس پھیلانا ہوتا ہے۔ یہ پوری داستان واضح کرتی ہے کہ انتہاپسندی اور تشدد کا راستہ، چاہے کسی بھی نظریے کے تحت ہو، انسان کو صرف تنہائی، ندامت اور مکمل بربادی کی طرف لے جاتا ہے:

> "ان دنوں کنول جیت کالج میں پڑھتی تھی۔ وہ جوانی کی پر بہار وادی میں قدم رکھ چکی تھی۔ اس کے اردگرد خوشیاں تھیں، زندگی تھی اور قہقہے تھے۔ وقت بڑے پرسکون انداز میں گزر رہا تھا۔ وہ چار بہن بھائی تھے۔ ایک اس سے بڑا، ایک چھوٹی بہن اور پھر بھائی۔ اس کا بڑا بھائی امرتسر میں جاب کرتا تھا اور خالصتان تحریک کا زبردست حامی تھا، یہی جرم تھا جو اس کی زندگی کے خاتمے کا باعث بنا۔ وہ ان دنوں امرتسر سے ہوشیارپور آیا ہوا تھا۔ کنول جیت جب کالج سے واپس آئی تو گھر میں ماں سمیت تینوں بھائی بہن قتل کیے جا چکے تھے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کے لاشے لہو سے تر دیکھے تھے۔ وہ بھیانک منظر وہ برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو گئی۔ بظاہر قتل کی وجہ ڈکیتی ہی تھی لیکن چند دنوں بعد ہی اسے اور اس کے باپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ خالصتان تحریک کے حمایت کرنے کی سزا ہے۔"[١٦]

انتہاپسندی کا یہ ناسور صرف انفرادی یا خاندانی سطح تک محدود نہیں رہتا، بلکہ جب یہ سیاسی رنگ اختیار کرتا ہے تو اس کی زد میں لاکھوں معصوم عوام آ جاتے ہیں اور پوری ریاست اس کا شکار بنتی ہے۔ دہشت گردی کے اسی عوامی اور ریاستی المیے کا نقشہ سید کاشف رضا کے ناول "چار درویش اور ایک کچھوا "میں کھینچا گیا ہے، جہاں کارساز (کراچی) کے لرزہ خیز دہشت گردانہ حملے کو ایک عینی شاہد کی نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کا آغاز اپنے لیڈر کے استقبال کے لیے جمع لاکھوں لوگوں کے جوش و خروش سے ہوتا ہے، لیکن رات کے بارہ بجتے ہی وہ روشن سڑک بارود کے دھوئیں، آگ اور لاشوں کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دہشت گردوں نے مکر و فریب سے پہلے ایک چھوٹا دھماکا کیا تاکہ لوگ جمع ہوں، اور پھر دوسرے بڑے دھماکے سے خوف و ہراس کا وہ جہنم سلگایا جس کا مقصد قوم کی امن کی امیدوں کو ملیامیٹ کرنا تھا۔ یہ المناک واقعات محض تاریخ کا حصہ نہیں بلکہ ایک ایسا ناسور ہیں جنہوں نے معاشرے اور خاندانوں کو نفسیاتی طور پر تباہ کر دیا۔ دہشت گردی صرف جانیں نہیں لیتی بلکہ خوابوں کو بھی بکھیر دیتی ہے، اور اپنے پیاروں کو کھونے والوں کا یہ کرب پوری ریاست کا المیہ بن جاتا ہے۔ بارود کی بو تو مٹ جاتی ہے، لیکن پیچھے رہ جانے والے یتیموں اور بیواؤں کی ادھوری زندگیاں ہمیشہ تڑپاتی رہتی ہیں۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں راولپنڈی کا لیاقت باغ اس بربریت کا ہولناک مرکز رہا ہے۔ پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کی شہادت نے ملک میں سیاسی عدم استحکام کا جو بیج بویا، اس کے اثرات دہائیوں بعد بھی ختم نہیں ہوئے، جب اسی مقام پر بے نظیر بھٹو کو خودکش حملے میں شہید کر دیا گیا۔ ان سیاسی قتل و غارت گری کے واقعات نے ملک کے مستقبل کو گہرے زخم دیے؛ اگر یہ مہیب سانحے نہ ہوتے تو آج پاکستان کا سیاسی نقشہ یقیناً بالکل مختلف اور بہتر ہوتا۔

ان خونی واقعات کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ دہشت گردی نے صرف سیاسی لیڈروں کو ہی نہیں مٹایا، بلکہ خاندانوں اور پوری قوم پر گہرے نفسیاتی زخم چھوڑے۔ لیاقت علی خان سے لے کر بے نظیر بھٹو تک کی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ اگر سکیورٹی انتظامات بہتر ہوتے اور بروقت فیصلے کیے جاتے، تو ملک ان بڑے سانحات سے بچ سکتا تھا۔ سیاسی اختلافات کے لیے تشدد کا راستہ اپنانے سے ہمیشہ ریاست کمزور ہوئی، جمہوریت کو نقصان پہنچا اور عوام کو صرف دکھ ملے۔ مختصر یہ کہ انتہا پسندی ایک ایسا ناسور ہے جس نے پاکستان کی تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا اور اس کی قیمت ملک کو قیمتی جانوں کے ضیاع اور ترقی میں رکاوٹ کی صورت میں چکانی پڑی:

> "جلسے سے نکل کر وہ ابھی لیاقت باغ لائبریری کے پاس پہنچے تھے کہ ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی تھی۔ دھماکا لیاقت روڈ کی طرف ہوا تھا۔ آفتاب بھاگتا ہوا دھماکے کی جگہ پر گیا تھا اور زخمیوں کو ایمبولینسوں میں سوار کرانے میں مدد کر تا رہا تھا۔ وہاں بے نظیر کی گاڑی موجود نہیں تھی لیکن کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ دھماکا اس کی گاڑی کے پاس ہوا ہے۔ شام تک پورے شہر میں پہلے اس کے زخمی ہونے اور پھر اس کی موت کی افواہ گردش کرنے لگی جس کی کچھ ہی دیر میں تصدیق بھی ہو گئی تھی۔"[۱۷]

راولپنڈی کا لیاقت باغ ایک بار پھر دہشت گردی کا نشانہ بنا، جو پہلے ہی ایک وزیر اعظم کی شہادت کا گواہ تھا۔ وہاں موجود آفتاب اقبال ابھی شہر کے خراب حالات اور بے نظیر بھٹو کی سیکیورٹی کے خوف میں مبتلا ہی تھا کہ ایک زوردار دھماکے نے جلسہ گاہ کو مقتل میں بدل دیا۔ آفتاب نے اپنی جان کی پرواکیے بغیر زخمیوں کی مدد شروع کر دی۔ اس حملے نے نہ صرف ایک بڑی سیاسی رہنما کو نشانہ بنایا بلکہ جمہوریت کی امیدوں کو بھی شدید ٹھیس پہنچائی۔ یہ واقعہ لیاقت باغ کی اسی خونی تاریخ کا تسلسل تھا جہاں بار بار سیاسی خون بہایا گیا اور عام شہری اس بربریت کے عینی شاہد بنے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ تمام ادبی بیانیے اور واقعات اس تلخ حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ دہشت گردی عصرِ حاضر کا وہ ناسور ہے جس نے انسانیت کے وجود پر ان مٹ زخم لگائے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول "قلعہ جنگی" اور زیف سید کے ناول "گل مینہ" سے لے کر امجد جاوید کے "روشن اندھیرے" اور کاشف رضا کے "چار درویش اور ایک کچھوا" تک یہ تمام تخلیقات اس ہولناک سچائی کو بے نقاب کرتی ہیں کہ جب نظریاتی انتہا پسندی انسانی ہمدردی پر غالب آ جائے، تو معاشرے کا پورا نفسیاتی اور سماجی ڈھانچہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔ یہ داستانیں صرف جانی نقصان کا ذکر نہیں کرتیں، بلکہ ان ادھورے خوابوں، اجڑے ہوئے سہاگوں اور ان نفسیاتی زخموں کا نوحہ ہیں جو بارود کا دھواں چھٹ جانے کے بعد بھی نسلوں تک باقی رہتے ہیں۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ، خاص طور پر لیاقت باغ کے خونی سانحات، اس بات کی یاد دہانی کرواتے ہیں کہ سیاسی اور نظریاتی اختلافات کو جب تشدد کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، تو اس کی قیمت پوری ریاست کو چکانی پڑتی ہے۔ دہشت گردی محض ایک فرد کو نشانہ نہیں بناتی، بلکہ وہ ریاست کی رٹ، عوامی اعتماد اور خاندانی نظام کو جڑوں سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ دہشت گردی کو محض ایک سیاسی یا فوجی مسئلہ سمجھنے کے بجائے ایک گہرے انسانی المیے کے طور پر دیکھا جائے۔ حقیقی امن کا راستہ صرف ہتھیاروں سے نہیں، بلکہ شعور کی بیداری، سماجی انصاف اور رواداری کے فروغ سے ممکن ہے۔ جب تک ہم قلم اور کتاب کی حرمت کو بندوق پر فوقیت نہیں دیں گے اور ان آوازوں کو نہیں سنیں گے جو اس وحشت کے ملبے تلے دب گئی ہیں، تب تک انسانیت کا سر شرم سے جھکا رہے گا۔ یہ وقت ہے کہ ہم نفرت کے اس تسلسل کو توڑ کر ایک ایسے روشن مستقبل کی بنیاد رکھیں جہاں کوئی "گل مینہ" اپنے پیارے کی لاش کے لیے نہ تڑپے اور جہاں انسانی جان کی حرمت ہر نظریے اور ہر مفاد سے مقدم ہو۔

حوالہ جات

1. Horn by,A.S, & Cowie , A.P.(1995).oxford advanced learner's dictionary (vol.1430) Oxford: Oxford university press,P.984

2. https://www.merriam-webster.com /dictionary /terrorism

۳۔ مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات، نیا ایڈیشن، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۶۵۸

۴۔ مولوی نور الحسن نیئر، نور اللغات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص:۸۰۵

5.https://www.newageislam.com/urdu-section/basil-hijazi,–new-age-/d/113598دہشت گردی کا

مفہوم Islam / the – concept – of – terrorism

6.The New Encyclopedia bol 11, Anniversary Edition, Collier and son company, new York, page 65

۷۔ طاہر القادری، ڈاکٹر، دہشت گردی، (مضمون)، مطبوعہ، ماہنامہ منہاج القرآن، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ستمبر ۲۰۰۱ء، ص ۴۲۔۴۳

۸۔ سیموئل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، محمد احسن بٹ، مترجم، مثال پبلشنگ، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۶۔۱۵۷

۹۔ انعام الرحمن سحری، دہشت گردی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۴۰-۴۱

۱۰۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، پورب اکیڈمی، اسلام آباد مئی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۱-۱۲

۱۱۔ فوزیہ، چودھری، ڈاکٹر، ۹/۱۱ کے اردو ناول پر اثرات، مشمولہ، پاکستانی زبان و ادب پر ۹/۱۱ کے اثرات، ادارہ ادبیات اردو فارسی و لسانیات، جامعہ پشاور، اگست ۲۰۱۰ء، ص ۹۷

۱۲۔ مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۴۴-۴۵

۱۳۔ فوزیہ، چودھری، ڈاکٹر، ۹/۱۱ کے اردو ناول پر اثرات، مشمولہ، پاکستانی زبان و ادب پر ۹/۱۱ کے اثرات، ادارہ ادبیات اردو فارسی و لسانیات، جامعہ پشاور، اگست ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۵

۱۴۔ آزاد مہدی، اس مسافر خانے میں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ ء، ص ۷۲

۱۵۔ زیف سید، گل مینہ، رمیل ھاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء، ص ۱۶۶

۱۶۔ امجد جاوید، روشن اندھیرے، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۱۵

۱۷۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، دانیال پبلشرز، کراچی، ۲۰۱۸ء، ص ۱۴۱